معاشرتی ترقی میں ادب کا کردار

R0LE OF LITERATURE IN SOCIAL DEVELOPMENT

Dr. Ansaruddin Madani
Dr.Faza Muslim

Abstract:

Man naturally takes intrest in poetry and literature. In fact, literature etiquette is elegant jewelry for a man. Although there are not the real tastes of an individual's physical beauty in poetry & literature but, it is the aspect of inner beauty of a person with which he not only beautifies himself but also his society. So literal people can play a better role in the society for wellbeing and with the strength of the character they can make individuals the subject to social obligations. For this sake, Urdu language & literature can also play an excellent role in an individual's life for the building and betterment of a better society. Therefor, it is fundamental to develop Urdu literature and sustain it.

Keywords: *Literature, Urdu, Development, Culture, Beauty, Society.*

خلاصہ

اس مقالہ میں مقالہ نگار نے معاشرتی ترقی میں ادب کے کردار کو اجاگر کیا ہے۔ ان کے مطابق، انسانی فطری طور پر شاعری اور ادب میں شغف رکھتا ہے۔ دراصل، ادب انسانی تہذیب کا زیور ہے۔ اگرچہ ادبیات میں مادی حسن نظر نہیں آتا لیکن یہ انسان کے باطنی حسن کا آئینہ دار ہیں۔ ادیب اپنے باطنی حسن کی جلوہ گری کے ذریعے اپنے معاشرے کی اصلاح کر سکتا ہے اور معاشرے میں اعلی انسانی اور اخلاقی اقدار کو پروان چڑھا سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اردو زبان و ادبیات ہمیشہ ایک خاص اہمیت کی حامل رہی ہیں۔ بنابریں، معاشرتی اصلاح اور ترقی کے دعویداروں کو نہ فقط اردو ادبیات کو پروان چڑھانے، بلکہ اسے پائیدار رکھنے کی ضرورت ہے۔

کلیدی کلمات: ادب، اردو، ترقی، تہذیب، حسن، معاشرہ۔

معاشرہ اور ادب

ادب افراد اور اقوام کی فکری اور نظریاتی تشکیل میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ ادیب معاشرے کا دماغ ہوتا ہے اور ان خیالات کا مظہر ہوتا ہے جو کہ ایک معاشرے میں پائے جاتے ہیں۔ انہی خیالات کو ادیب ایک سانچے میں ڈال کر حسین پیرایا عطا کرتا ہے۔ یہی ادیب کبھی انسانوں کی صورت میں معاشرے کی تصویر کشی کرتا نظر آتا ہے اور یہی اس کا حسن بیان اور اس کی شناخت بن جاتا ہے۔ وہ اپنے تجربات اور احساسات کو لے کر اپنی تہذیب وثقافتی اقدار کو ہمیشہ پیش نظر رکھتا ہے اور جب یہی ادیب اپنے اوپر شاعری کا لباس پہنتا ہے۔ تب ہی اس کی سوچ کا محور اس کی تہذیبی اقدار ہوتی ہیں۔ اس کا مقصد نظم یا نثر دونوں صورتوں میں افراد واقوام کی فکر و نظریا کارفرما ہوتا ہے اور جب یہی نظم صوفیانہ شاعری کا رنگ اختیار کر لے تو اس میں اعلیٰ انسانی اقدار کے ساتھ ساتھ مقصد کے معنی بھی سمائے ہوئے ہوتے ہیں۔ پھر جیسے ہی قصوں اور کہانیوں داستانوں کو عا محفل اور مجالس میں بیان کرنے کا سلسلہ شروع ہوا تو دلچسپی کے ساتھ سننے کا سلسلہ وسیع تر ہو گیا اور پھر گیتوں اور داستانوں کی بھی اہمیت میں اضافہ ہوا۔ اگر ہم یہ کہیں کہ ادب براہ راست ہماری زندگی سے تعلق رکھتا ہے تو بے جا نہ ہوگا۔

کیونکہ ادیب ایک عظیم تہذیبی وثقافتی روایت کا علمبردار آزادی اور اخوت کا پرستار رہا ہے۔ ہمیشہ آگے کی طرف قدم بڑھاتا، اپنی قدروں کی پرستش کرتا اور انسانی محبت کے گیت گاتا ہوا، اقدار کیر کے نغمے سناتا نظر آتا ہے۔ یہ ادیب ہی ہے جو اپنے قلم سے خیالات اور واقعات کی تصویر کشی کرتا ہے۔ ہم خوش قسمت ہیں کہ پاکستان کی سرزمین پر کئی نامور ادیبوں، شاعروں اور افسانہ نگاروں نے جنم لیا ہے جو عالمی سطح پر اس ملک کی پہچان ہیں۔ مگر گزرتے وقت کے ساتھ ایسا بھی ہوا بقول ڈاکٹر انعام الحق کوثر: ''آج کل تو کچھ ادیب ایسے ہیں جو اپنے آپ کو ادیب ظاہر کرتے ہیں نمود و نمائش ان کا شیوہ ہے تکلف و تصنع ان کا شعار ہے یہ لوگ الٹی سیدھی چیزیں لکھ کر ادیبوں کی صف میں اپنی جگہ بنانے کے خواہش مند ہیں ظاہر ایسے ادیبوں کی تحریروں میں کوئی تجربہ نہیں ہوتا وہ تو محض شہرت حاصل کرنے کے خیال سے ادب کو اختیار کرتے ہیں''۔[1]

یہ حقیقت ہے کہ گذشتہ چند سالوں سے ادب کے نام پر جو تماشے ہو رہے ہیں اس کی وجہ سے ایک بے حسی کا عالم طاری ہے وہ ادیب جن کی تحریروں میں کوئی حقیقت پر گہرا اثر پڑھتا ہے لوگوں کے اوپر اب کوئی اثر نہیں ہوتا اب ایسی محسوسات بالکل ناپید ہیں۔ مثلاً پرانے لکھنے والوں میں بیگم عبدالحفیظ کا ناول تہنیت جو کہ ۱۹۵۹ء میں منظر عام پر آیا۔ خورشید عبدالحفیظ کا یہ ناول بڑے خوبصورت انداز میں معاشرے کے عیوب و نقائض کو بیان کرتا ہے۔ انہوں نے اس ناول میں ہندوستان کے مسلمانوں کی داستان زوال اور دور حاضر کی تعلیمی اور سیاسی جدوجہد کا آغاز کو

افسانے کی شکل میں پیش کیا۔ مصنفہ ایک جگہ لکھتی ہیں: ارے میاں باادب، بانصیب، بے ادب، بے نصیب۔ بزرگوں کی بات کا بُرا نہیں ماننا چاہیے وہ خواہ کچھ بھی کہیں وہ بزرگ ہیں۔ انہیں حق ہے۔ تمہاری سعادت مندی کا تقاضہ یہ ہے کہ تم سب کچھ برداشت کرو اور چپ رہو، اس میں تمہاری بڑائی اور اس سے خدا اور اس کے رسول خوش ہوتے ہیں۔ خوشحالی آتی ہے۔[2]

اس پیراگراف میں مصنفہ نے اتنے خوبصورت انداز میں ایک اسلامی قدر کو اجاگر کیا ہے کہ بڑوں کے آگے خاموشی اختیار کرو۔ ادب کا تقاضہ ہے کہ انسان اپنے بڑوں کے آگے زبان درازی نہ کرے اس سلسلے میں سرورکائنات حضرت محمد ﷺ کا ارشاد گرامی ہے کہ: جوانی میں کیے گئے ہر عمل بڑھاپے کی نسبت دوگنا اجر ہے۔[3]
بیگم خورشید لکھتی ہیں کہ: ”ہمارا تعلق بھی شاہی خاندان سے ہے، چنے کے ساتھ گھن بھی پسے گا ہم پر بھی مصیبت آئے گی جس طرح پیڑیوں سے سارا کنبہ ساتھ رہا اب بھی ساتھ میں مرے گا اور جئے گا۔ چند لوگوں کے حسرت و یاس سے دل کا جائزہ لیا، دل نے کہا تیرا وطن اس کے سوہنی مٹی دریاؤں کا میٹھا پانی معتدل نرم و نازک ہوائیں، لہلہاتے کھیت، آزادی، پیاری آزادی، کندن کی طرح دمکنے لگے“۔[4]

اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان جہاں رہتا ہے اس جگہ سے انسان کو محبت ہوتی ہے۔ یہ صفت تو جانوروں میں بھی پائی جاتی ہے کجا انسان۔ مگر جب بات آزادی کی ہو جہاں سب کچھ اس کا اپنا ہو۔ اپنی مرضی سے سانس لینا ہو، تو اس آزادی کی خاطر انسان سب کچھ چھوڑنے پر راضی ہو جاتا ہے۔ اسلام میں اس کی مثال ہجرت کی صورت میں موجود ہے کہ جب حضور اکرم ﷺ اور آپ ﷺ کے اصحاب پر جب ظلم و ستم کی حد بڑھ گئی تو آپ ﷺ نے ہجرت کا حکم دیا۔ اور آپ ﷺ سمیت سب نے ہجرت کی آزادی کی خاطر ہجرت کرنا ہماری ایک قدر ہے اور یہ قدر ہمارے اقدار میں شامل ہے۔

اسی طرح وحیدہ نسیم کا ناول شبورانی بھی بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ ۱۹۷۶ء میں یہ ناول منظر عام پر آیا، اور چھا گیا۔ یہ ناول بیک وقت رومانوی بھی ہے اور تاریخی بھی مصنفہ نے محبت کو اپنی اقدار کی پاسداری کرتے ہوئے بڑے حسین انداز سے لکھا ہے۔ شبورانی ایک نازک اندام لڑکی ہے جو ڈگری یافتہ نہ ہونے کے باوجود ہمارے معاشرے کی جان ہے، یہ ایک تہذیب یافتہ کردار ہے، اس کردار نے نسوانیت کو معراج پر پہنچایا۔ ایک عورت جسے اسلام اپنی حدود میں رہ کر آزادی دیتا ہے۔ اس کردار نے اپنی حدود میں رہ کر کردار کو منوایا ہے اور پھر عاشق و معشوق کی اعلیٰ اقدار کو متعارف کرایا ہے اور انسان کو کسی بھی معاملے میں خود غرض نہیں ہونا چاہیے۔ مصنفہ لکھتی ہیں:

”ارے ممتاز آج تم، ناشتہ تیار کر رہی ہو، ہاں رحمان کو بخار ہے، وہ تو ایک ہفتے سے بیمار ہے، لیکن یاسین کہاں ہے؟ وہ بھی کل رخصت ہوگئے۔ آپ چلیئے میں ابھی ناشتہ لاتی ہوں۔ ممتاز نے مسکرا کے کہا اور خالد سمجھ گئے کہ اس

وقت باورچی خانے میں اس کا ٹھہرنا مناسب نہیں۔ اس لئے وہ صحن طے کرتا ہوا دالان میں آیا جہاں اس کے ماموں اخبار پڑھ کر اس کو تہہ کر رہے تھے اور ممانی جان وظیفے سے فارغ ہو کر جائے نماز کا کونہ الٹ رہی تھیں"۔ [5]

یاسین اور رحمان کا کردار گھر کے ملازمین کا ہے مگر اس میں ایک احساس اجاگر ہے کہ بیشک وہ ملازم ہیں مگر ان کی تکلیف کو محسوس کیا گیا ہے ہمارا دین ومذہب بھی اسی بات کی تاکید کرتا ہے کہ انسانیت کا احترام سب پر لازم ہے وہ احساس اس ناول میں نظر آرہا ہے۔ پھر نماز کا پڑھنا اس کی اہمیت کو بھی اجاگر کر رہا ہے کہ گھر کے بزرگ صبح دیر تک عبادت الٰہی میں مشغول رہتے ہیں۔ اس منظر میں ایک مسلم گھرانے کی تہذیب اجاگر ہو رہی ہے۔ دراصل، ہماری مشرقی تہذیب کا خاصہ ہے کہ جب لڑکا اور لڑکی کی نسبت طے ہو جائے تو ان کے درمیان جب تک شادی نہیں ہو جاتی، ایک لحاظ آجاتا ہے۔ یہی لحاظ ہماری تہذیبی قدر ہے، اور اسی قدر کو مصنفہ نے اجاگر کیا ہے۔ "ارے بیٹا! تم نے شبورانی کو دیکھا ہے؟ سنتی ہوں بڑی خوبصورت ہے۔ ممانی جان نے کمرے میں آکر پوچھا اور ممتاز کے قدم جاتے جاتے رک گئے، ہوگی خوبصورت، اتنا تو میں نے بھی دیکھا ہے۔ خان بہادر صاحب کا گھرانہ قدیم ہے، اور پردے کا سخت پابند ہے۔ پردے کا پابند ہے! عجیب بات ہے حالانکہ بڑے گھروں میں بلعموم پردہ زیادہ نہیں ہوتا۔ دیکھتے نہیں، زمانے میں کتنی فیشن کی ہوا چلی ہے"۔ [6]

انسان کتنا ہی ترقی کی منازل طے کرے مگر اسے اپنی روایات کو برقرار رکھنا چاہیئے اور یہی روایات اس کا قیمتی اثاثہ ہوتی ہیں۔ اپنی روایات کی بدولت اس کی پہچان ہے اسی طرح پردہ بھی ہماری روایات کا حصہ ہے۔ ہماری تہذیبی روایات میں مردان خانہ اور زنان خانہ موجود ہے۔ مگر وقت کے بڑھتے سائے اس روایت کو فراموش کر چکے ہیں۔ مگر ادیبوں نے اپنی تحریروں میں نئی تہذیب کو ہی موضوع سخن بنایا ہے کہ ہماری تہذیب کیوں کر ایک بہترین تہذیب بن سکتی ہے۔ یہ تمام اقدار کہ جو ہماری معاشرت میں شامل ہو کر زندگی کو ایک حسن بخشتی رہی ہیں ہمیں دوسری تہذیبوں سے ممتاز کر رہی ہیں۔ رات کا سناٹا بار بار اس کو شبورانی کے الفاظ یاد دلاتا رہتا ہے کہ:

"جب آپ تنہا ہوتے ہیں تو کبھی اس تنہائی میں غور کریں جب کوئی اور پاس نہیں ہوتا تو آدمی کے دل کے اندر چھپا ہوا انسان جاگ اٹھتا ہے جس کو روز اول فرشتون نے سجدہ کیا۔ اگر ہو سکے تو اس کی آواز سنئے، وہ آپ کو فرش سے اٹھا کر عرش تک لے جائے گا۔ انسان اگر انسانیت کے مرتبے سے گر جائے تو اس کی ہستی ایک مشت خاک سے کچھ زیادہ نہ رہے جس کو اڑا کر منتشر کرنے کے لئے ہوا کا ایک ایک جھونکا کافی ہے"۔ [7]

شاید یہی طرز فکر تھا جس نے خالد کو کبھی راہ سے بے راہ ہونے دیا۔ پاکستان سے والہانہ محبت اور قائد اعظم سے دیوانہ وار عقیدت یہی وہ شئے تھی جس کے سہارے وہ زندہ تھا۔ ورنہ ماحول اس کے لئے سازگار نہ تھا۔ وہ کبھی قدم قدم پر کھلے انگریزی اسکول کو دیکھتا اور کبھی ان بچوں کو دیکھتا جو اپنی تہذیب سے بیگانہ تھے اور کبھی مقدس درسگاہوں

میں رقص کے مظاہروں کو دیکھتا تو گھنٹوں سوچتا کہ آخر یہ ہمارے طبقے کی تہذیب ہے جو عام ہو رہی ہے۔ آج ہماری تہذیب جس ڈگر پر چل رہی ہے۔ قائداعظم نے کبھی ایسا سوچا بھی نہ ہوگا کہ وہ ملک جس کو اتنی کوششوں اور قربانیوں سے حاصل کیا جارہاہے، آئندہ پچاس، ساٹھ برسوں میں اس ملک اور اس کی تہذیب کا کیا حال ہوگا؟ آج ہماری تہذیب اصل رنگ سے ہٹ چکی ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ علم وادب ایمان کی جڑوں کو گہرا اور مضبوط کرتا ہے:
"جب اسلام پھیل گیا اور جزیرۃالعرب سے دوسرے ممالک تک پہنچا تو ان ممالک کے عام لوگوں میں اسلام کو جلدی قبول کرلیا۔ لیکن جو لوگ علم وادب سے آگاہ تھے۔ انہوں نے اسلام کو جلدی قبول نہیں کیا۔ بلکہ ایک مدت گذر جانے کے بعد جب ان پر ثابت ہوگیا کہ اسلام دنیاوآخرت کا دین ہے تو پھر انہوں نے اسے قبول کیا"۔[8]
معصوم ادب کو یوں بیان کرتے ہیں کہ: " ادب ایک لباس سے عبارت ہے جو تحریر اور تقریر کو پہناتے ہیں"۔[9]
گویا ادب کے ذریعے تحریروں اور تقریروں کو پُرکشش بنایا جاسکتاہے۔ اس بات کو تقویت گزرے ہوئے مصنفین کی تحریروں سے ملتی ہے۔ ممکن ہے کہ ادب علم نہ ہو۔ لیکن علم کا وجود ادب کے بغیر محال ہے۔ اس لئے معصوم فرماتے ہیں کہ: " یتیم وہ نہیں جس کا باپ فوت ہوگیاہو، یتیم وہ ہے جو علم وادب سے بے بہرہ ہو"۔[10]
انسانی وقار کی سربلندی اور انسانوں میں اچھی صفات کے فروغ کے لئے بھی علم وادب لازمی جزو ہے، کیونکہ ایک ایسا معاشرہ جس کے افراد ادیب وعالم ہوں اس میں دوسروں کے حقوق کی پامالی کم دیکھنے میں آتی ہے اور اگر سب علم وادب سے آشنا ہو جائے تو تمام طبقوں کے باہمی تعلقات خوشگوار ہو جائیں۔

حاصل کلام

معاشرے کی سب سے بڑی خرابی اس وقت پید ہوتی ہے جب معاشرہ تعمیر و تخیل اور تخلیق کے معاملات سے دور ہو جاتاہے۔ اس صورت حال کے ذمہ دار وہ ہوتے ہیں جو معاشرے میں موجود افراد کی ذہنی، فکری صلاحیتوں کو اجاگر کرنے کے بجائے ان پر شعور وادراک کے دروازے بند کردیتے ہیں۔ ادب معاشرے کا اہم ستون ہے۔ آج سب سے اہم مسئلہ ادب کے معیار کا ہے۔ آج دنیا میں مقابلے کی دوڑ میں شامل ہونے کے لئے ہم نے اپنے اپنے معیارات قائم کرلئے ہیں۔ کہیں ہم ادب کی شائستگی کو معاشرے کی گلیوں میں تلاش کرتے ہیں تو شاعرانہ طبیعت کو استعمال کرتے ہوئے ہجر ووصال کی کیفیت بیان کرتے ہیں۔ اب ان میں سے کون سا معیار بہترین ہے یہ تو وقت اور حالات بہتر فیصلہ کرسکتے ہیں۔ کیا نثر میں ہمارا معیار اس بلندی پر ہے جہاں ہم سرسید، ابوالکلام، اشفاق احمد، مشتاق احمد یوسفی، غلام عباس جیسے بہت سے مصنفوں کی تحریروں کو مستند جانتے ہیں اور ان کے انداز بیان کو اپناتے ہیں۔ کیا ناول نگاری میں وہ معیار موجود ہے جو خدیجہ مستور، ہاجرہ مستور، قرۃالعین، بیگم خورشید اور انہی کے دور کے اور سے بہت سے ناول نگاروں کا آج کے دور میں ناول نگاروں سے موازنہ ہے؟

آج کا ناول نگار ایک افسانہ لکھتا ہے جس میں نہ معاشرے کی عکاسی ہوتی ہے اور نہ اپنی اقدار کی پاسداری کا ان کی تحریروں میں خیال ہے۔ اسی طرح شاعری میں میر درد، غالب، اقبال، فیض احمد فیض۔ اگر ان شخصیتوں کو پڑھ کر کوئی بھی شاعر یا نثر نگار مجموعی طور پر بہترین ادب کا خالق ہو سکتا ہے۔ ادب میں تعصب کی کوئی گنجائش نہیں۔ ادب چاہیے کسی بھی ملک کا ہو، کسی بھی شہر کا ہو، یعنی جس بھی رنگ و نسل سے تعلق رکھتا ہو، اس کی سب سے اہم ذمہ داری معاشرے کے مزاج کو سمجھنا اور اس کے مطابق تہذیبی، ادبی، ثقافتی روایتوں کو ہر عام و خاص کے ذہن میں تازہ کرنا ہے۔ آج اکیسویں صدی کے اس دور میں ہر گزرتے پل کے ساتھ ادب کو نئے تقاضوں کا سامنا ہے۔ جہاں امن و آشتی کی آزادی ہر انسان کے دل کی آواز ہے۔

*****

حوالہ جات

1۔ ڈاکٹر انعام الحق، کوثر، *بلوچستان میں تحریک تصوف* (بلوچستان، سیرت اکادمی، 1986ء) 117۔

2 ۔ بیگم خورشید، عبدالحفیظ، *تہنیت* (کراچی، ندارد، 1959ء) 99۔

3۔ ذوالفقار، زیدی، *اقوال معصومین* (کراچی، الحرمین پبلیشرز، 2002ء) 3۔

4۔ بیگم خورشید، *تہنیت*: 100۔

5۔ وحیدہ نسیم، *شبورانی*، ندارد (کراچی، ندارد، 1976ء) 10۔

6۔ ایضا: 30۔

7۔ ایضا: 480۔

8۔ نقی، نقوی، *تاریخ اسلام* (کراچی، پریمہ پرنٹر، 1992ء) 10۔

9۔ عبدالکریم، *سپرمین ان اسلام*: 155۔

10۔ ایضا: 156۔

کتابیات

1) کوثر، ڈاکٹر انعام الحق، *بلوچستان میں تحریک تصوف*، بلوچستان، سیرت اکادمی، 1986ء۔

2) عبدالحفیظ، بیگم خورشید، *تہنیت*، کراچی، ندارد، 1959ء۔

3) زیدی، ذوالفقار، *اقوال معصومین*، کراچی، الحرمین پبلیشرز، 2002ء۔

4) نسیم، وحیدہ *شبورانی*، ندارد، کراچی، ندارد، 1976ء۔

5) نقوی، نقی، *تاریخ اسلام*، کراچی، پریمہ پرنٹر، 1992ء۔

6) عبدالکریم، *سپرمین ان اسلام*۔